

تم میری عید پیا

نازیہ کنول نازی

کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

پاکستانی پوائنٹ کوئی تجارتی ویب سائٹ نہیں ہے یہاں پر موجود تمام ناولز بالکل مفت ہیں۔ اس مشن کا مقصد صرف اردو ادب کی خدمت کرنا ہے تاکہ وہ لوگ جو وطن سے دور ہیں اور اردو کتب حاصل نہیں کر سکتے، وہ یہاں سے ڈاؤن لوڈ کر لیں۔ اگر آپ اردو لکھنا جانتے ہیں تو آپ بھی روز کا ایک صفحہ کمپوز کر کے اس مشن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے، سپر موڈز: زندگی، بسمہ، حبیب یا مینجمنٹ و قار سے رابطہ کریں، شکریہ

تم میری عید پیا

وہ مجھے اس وقت ملا تھا جب

پہاڑوں پر برف پگھل رہی تھی

چیری کے درختوں پر اولین شگوفے پھوٹ رہے تھے

نوخیز خوشبو سے سارا باغ معطر تھا

بلبل نے بس ابھی چہکنا شروع کیا تھا

اپنے بازوؤں میں لیے وہ مجھے

پھولوں بھری وادی میں گھومتا رہا

ہم تتلیاں اور جگنو پکڑتے رہے

بارش اک پیاری دوست کی طرح ہمارا ہاتھ بٹاتی رہی

جس دن درخت سے پہلا پتہ گرا

میں اسے اٹھانے کے لیے جھکی

پلٹ کر دیکھا تو وہ جاچکا تھا

اب میں ٹوٹے ہوئے پتوں میں اپنے آنسو جمع کر رہی ہوں

مجھے جان لینا چاہیے تھا کہ میرا اور اس کا ساتھ

بس موسم بہار تک ہی ہے

”تم انتہائی گھٹیا اور ذلیل شخص ہو حماد!“ وہ ڈرائیو کر رہا تھا جب اس کے موبائل اسکرین پر

آشنا نمبر سے یہ ایس ایم ایس شو ہوا، جواب میں وہ تپ اٹھا۔

”کیوں بھونک رہی ہو، کیا کیا ہے میں نے؟“ ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالے اس نے

فوراً سے پیش تر جواب ٹائپ کیا تھا، دوسری طرف سارہ اذہان کی بصراتوں کو جیسے یقین ہی

نہیں آیا، وہ شخص اتنی گھٹیا ٹائپنگ کر سکتا ہے، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

”کیا کیا ہے؟ تماشا بنا دیا ہے تم نے مجھے اپنے دوستوں میں، کیوں...؟ کیا بُرا کیا تھا میں نے

تمہارا صرف ایک اعتبار ہی تو کیا تھا ناں تم پر، اس کی اتنی بڑا سزا کیوں؟“

”بکو اس بند کرو، جس دوست نے بے غیرتی کی ہے، اس کی بہن اس وقت بھی میرے

ساتھ ہے، میں لاہور میں ہی ہوں۔“

”جسٹ شٹ اپ!“ ایک پل میں بھر آئی آنکھوں کے ساتھ اس نے ٹائپ کیا تھا، تبھی

اس کا جواب آگیا۔

”اپنی اوقات میں رہ کر بات کرو، میرا دماغ خراب مت کرو۔“

”اپنی اوقات میں ہی رہتی ہوں میں لیکن کاش! تم بھی اپنی اوقات میں رہو۔“ کپکپاتی

انگلیوں سے ٹائپ کرتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ سے گال رگڑا تھا۔

”مجھے تمہاری اوقات کا پتا ہے اور تمہیں میری ٹھیک ہے اب دوبارہ میسج مت کرنا۔“ اگلے پل پھر اس کے الفاظ اس کی سماعتوں پر پہاڑ گر رہے تھے۔ وہ رو پڑی۔

”تم نے میرا دل دکھایا ہے حماد! ایک بے لوث‘ بے غرض لڑکی کا اور جو کسی بے لوث بے غرض کا دل دکھاتا ہے اسے خدا کی طرف سے سزا ضرور ملتی ہے‘ وہ بھی کبھی نہ بھولنے والی‘ تمہیں بھی سزا ملے گی کیونکہ تمہارا معاملہ بھی میں اپنے خدا کے سپرد کر رہی ہوں۔ بے شک وہی بہتر جاننے اور انصاف کرنے والا ہے۔“

”میں کیسا ہوں‘ خدا جانتا ہے۔ اب دوبارہ میسج کیا تو اپنی بے عزتی کرواؤ گی۔“ انتہائی فاسٹ ڈرائیو کے باوجود وہ برابر جواب ٹائپ کر رہا تھا‘ سارہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔

”خدا تمہیں برباد کرے‘ اس سے بڑھ کر تمہارے لیے اور کوئی بد دعا نہیں ہو سکتی۔“

”اور تم اپنی نیت سے ہی برباد ہو‘ اتنی اچھی نہیں ہو تم‘ تمہیں پتا ہے۔“

یہ وہ شخص تھا جسے اس نے اپنے لیے بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے دیکھا تھا۔ مگر آج وہی شخص کھل کر اس کے سامنے آ رہا تھا‘ سارہ سرد وجود کے ساتھ سن سی بیٹھی رہی‘ اسے جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

بے ساختہ اسے چار ماہ قبل اپنی ماں کے کہے ہوئے الفاظ یاد آئے تھے۔

”خوب صورت لڑکا ہے‘ بھرپور مرد بھی ہے۔ مگر وہ تیرے معیار کا نہیں ہے سارہ! اس کی دنیا اور ہے‘ اس کی دنیا میں تیرے جیسی سادہ اور حساس لڑکی کی کوئی گجائش نہیں‘ اسی لیے میری بات مان اسے چھوڑ دے۔“

اور وہ جو اپنی ماں کی رائے پر ساکت رہ گئی تھی‘ کس قدر ہمت کے ساتھ اپنے نفس کے بے قابو گھوڑنے کو نکیل ڈالتے ہوئے اس نے اپنی ماں کے حکم پر سر جھکا دیا تھا۔ وہ شخص جو اس کا خواب‘ اس کی خوشی تھا۔ اس شخص کو اس نے چپ چاپ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا مگر وہ اسے اپنی دعائوں اور محبت کے حصار سے باہر نہیں نکال سکی تھی شاید اس شخص نے اس کی نگاہ میں اپنا مقام ہی ایسا بنا رکھا تھا کہ وہ نظر سے بہت کچھ دیکھنے کے باوجود اس شخص سے نفرت نہیں کر پائی تھی۔

یہ مائوں کے دلوں کے سگنل آخر اتنے درست کیسے مل جاتے ہیں؟

دل میں اٹھتے رنج و غم کے طوفان کو دباتے ہوئے اب وہ لکھ رہی تھی۔

”میں نے آج تک تمہارا بُرا نہیں چاہا، اپنی کسی دوست کو تمہارے بارے میں نہیں بتایا، تمہاری ساری حرکتیں جانتے ہوئے کبھی تم سے نفرت نہیں کی لیکن تم نے... تم نے کیا صلہ دیا؟ اپنے باپ کی قسم کھا کر بھی اپنے دوستوں میں کھیل بنا دیا تم نے مجھے، کیوں؟ میں نے تمہیں دوسرے لڑکوں سے مختلف سمجھا تھا۔“ اس کے لفظوں میں آگ کی لپٹیں تھیں، تبھی دوسری طرف سے جواب آیا تھا۔

”میں نے تمہارے ساتھ کچھ بُرا نہیں کیا، میرا خدا جانتا ہے۔“

”جسٹ شٹ اپ! میں اپنی ماں سے پیار کرتی ہوں، میں نے کبھی ان کی جھوٹی قسم نہیں کھائی، تمہارا کیسا پیار ہے اپنے باپ کے ساتھ کہ جن کی قسم کھانے کے باوجود تم نے میرا اعتبار توڑ دیا۔ کیا نقصان کیا تھا میں نے تمہارا؟ کیا عیش کیا تھا تمہارے ساتھ جو تم نے مجھ میں اور باقی عیش کرنے والی لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں رکھا، مجھے آج تم سے نفرت محسوس ہو رہی ہے حماد! بے حد نفرت... اس محبت سے بھی زیادہ نفرت جو میں نے تم جیسے انسان کے ساتھ کی تھی، آج مر گئے ہو تم میرے لیے، حماد نام سے ہی نفرت ہو گئی ہے مجھے۔“

بند دماغ کے ساتھ جانے وہ کیا کیا ٹائپ کرتی گئی تھی، دوسری طرف یکلخت خاموشی چھا گئی، صد شکر کہ اس وقت اس کے پاس کوئی نہیں تھا ورنہ شاید وہ اپنے آنسوؤں کی وضاحت کبھی نہ کر سکتی۔

...☆☆☆...

حماد ایک روایتی جاگیردار تھا، جس کے والد کی وفات اس کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی، بہت چھوٹی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے سبب وہ بھی بھٹک کر انہی رستوں پر چل نکلا تھا جو سوائے بربادی اور تباہی کے اور کہیں لے کر نہیں جاتے۔

اپنے گھر والوں پر اس کا کنٹرول تھا، باپ کے بعد بڑا ہو کر اس نے گھر کی کفالت سنبھال لی تھی تاہم اپنے نفس پر اسے کنٹرول نہیں تھا۔ روایتی جاگیرداروں کی طرح اگر اس کی بہن بنا دوپٹے کے گیٹ تک چلی جاتی تو اس کا خون رگوں میں مابلنے لگتا مگر نفس کی غلام اپنی جیسی دوسری پرانی لڑکیوں کو وہ صبح و شام یوں مسل کر پھینکتا تھا جیسے وہ گوشت پوست کے وجود نہ ہوں کوئی بے جان کھلونے ہوں۔

سارہ اذہان کو نہ اس کی اصلیت کا پتا تھا، نہ حسب نسب کا۔ وہ اپنی ہی دنیا میں رہنے والی ایک سادہ سی خاموش لڑکی تھی۔ جس کے خواب اس کے جینے کا حاصل تھے۔ ایم اے کرنے کے بعد اس نے تدریس کا شعبہ اپنا لیا تھا اور یہیں ایک نئی کہانی شروع ہوئی تھی، اس کی اسٹوڈنٹس اس پر جان لٹاتی تھیں، انہی جاں نثار طالبات میں سے ایک لڑکی عائشہ تھی، جس کا بھائی حماد نامی اس شخص کا دوست تھا۔

اسی کے ذریعے صبح و شام سارہ اذہان کی تعریف سن سن کر اس نے اس کا رابطہ نمبر حاصل کیا تھا حالاں کہ اس کی اپنی چھوٹی بہن بھی سارہ کی طالبہ تھی اور وہ بھی گھر میں اس کا ذکر کرتی تھی مگر وہ اپنی بہن سے فرینک نہیں تھا۔

قدرت نے اسے اچھی شکل و صورت سے نوازا تھا پھر پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی، ننھیال کی طرف سے اس کا خاندان سیاست میں بھی ملوث تھا، لہذا منہ زور گھوڑے کی طرح وہ زمانے کو پاؤں تلے روندتا آگے ہی آگے بڑھتا جاتا۔

شراب، شباب، سیاحت اور شکار اس کے بہترین مشاغل تھے۔ وہ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن تھا۔ پیسے کے بے دریغ ناجائز استعمال نے اس کے گرد خوشامدی اور مفاد

پرست دوستوں کا جھگڑا لگا دیا تھا اور یہی چیز اسے خوشی دیتی تھی۔ عورت کا اس کے نزدیک یہی مقام تھا کہ جیسے بھی ہو سکے پکڑو، مسلوا اور پھینک دو۔

یہی وجہ تھی کہ اس کی زندگی میں لڑکیوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی، خوب صورت سے خوب صورت، طرح دار سے طرح دار لڑکی کو وہ چیلنج سمجھ کر قبول کرتا تھا اور بالآخر اپنا مقصد حاصل کر کے رہتا تھا۔ کالج کی لڑکیاں اس کے حسن اور دولت کی دیوانی تھیں اور وہ اس دیوانگی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ سارہ اذہان کی طرف اس کی پیش قدمی بھی شاید اسی نیت کے تحت تھی تاہم وہ نہ اس کے حسن کی دیوانی تھی، نہ دولت کی۔ اس کے اپنے ہی خواب اور ترجیحات تھیں، جن میں نہ کسی لالچ کا کوئی گزر تھا نہ خواہش کا۔ وہ وقت اور حالات کی ڈسی ہوئی تھی، زندگی نے اس کے دل پر اتنے گھاؤ لگائے تھے کہ اسے جینے سے ہی نفرت ہو گئی تھی مگر پھر بھی وہ جی رہی تھی۔

حماد نامی اس شخص سے اس کا رابطہ چند ماہ قبل ہوا تھا۔ رات کا وقت تھا اور وہ اپنی ماں کے ساتھ گہری نیند سو رہی تھی جب اس شخص نے اسے مسلسل کال کر کے جگا دیا۔

”کون؟“ اسے گہری نیند سے بیدار ہونے کا غصہ تھا مگر پھر بھی وہ تحمل سے بولی تھی تاہم دوسری طرف خاموشی رہی، وہ ابھی کال کاٹ رہی تھی جب وہ بول اٹھا۔

”کاشف!“

”کون کاشف؟ میں کسی کاشف کو نہیں جانتی؟“

”نہیں جانتیں تو جان جائیں گی، میں تو آپ کو جانتا ہوں ناں۔“ اس کی آواز پُر اثر نہیں تھی، وہ تپ گئی۔

”دیکھیے میں ابھی نیند میں ہوں، ابھی بات نہیں کر سکتی، پلیز دوبارہ ڈسٹر ب مت کیجیے گا۔“

”جی ٹھیک ہے۔“

اس نے اس کی بات مان لی تھی، تاہم آگے آنے والے دنوں میں اس شخص نے اسے روزانہ ڈھیروں ایس ایم ایس اور ایم ایس بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ایم ایم ایس میں اسے صرف اپنی تصویریں بھیجنے کا شوق تھا۔

ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود سارہ اس سے قطعی انجان تھی مگر وہ اس سے انجان نہیں تھا اس کی شخصیت سے لے کر اس کے حالات زندگی تک سب اس کے علم میں تھے۔ عشق و عاشقی کے میدان کا وہ پکا کھلاڑی تھا۔

سارہ اذہان کے لیے اس کے ایس ایم ایس بھی غیر اہم تھے اور ایم ایم ایس بھی مگر وہ زیادہ دیر تک اسے نظر انداز نہیں کر سکی تھی۔

اس روز وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر بستر پر آئی تھی جب اسے اس کے نمبر سے ایک چونکا دینے والا ایس ایم ایس پڑھنے کو ملا۔ اس میسج میں حماد نامی اس شخص کی موت کی اطلاع کے ساتھ اس کی نماز جنازہ اور تدفین کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی۔ سارہ جانتی تھی وہ میسج حقیقت نہیں ہے اور یہ بھی کہ وہ ایسے میسج پہلے بھی پڑھ چکی ہے مگر پھر بھی وہ شاکد رہ گئی تھی۔ فطرتاً وہ حساس اور نرم دل لڑکی تھی، تبھی پہلی بار اس نے اسے رسپانس دیا تھا۔

”جسٹ شٹ اپ!“

اور دوسری طرف اس شخص نے اس کے جواب پر بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے فوری میسج کیا تھا۔

”شکریہ! آپ بہت اچھی ہیں قسم سے۔“ وہ سر جھٹک کر رہ گئی مگر اس روز کے بعد وہ شخص اس کے حافظے میں فٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک مختصر سی کال کے بعد اس شخص نے اس سے اپنے میسج کے لیے معذرت بھی کی تھی، سارہ نے اسے معاف کر دیا۔ اگلے روز پھر اس کا میسج آیا تھا۔

”میں اس وقت ایک کیس کے سلسلے میں عدالت میں ہوں، پلیز میرے لیے دعا کیجیے گا۔“ سارہ کو وہ شخص زندگی سے بے زار اور مشکلات میں گھرا ہوا محسوس ہوا تھا۔ تبھی اس نے لکھ دیا۔

”اللہ رحم کرنے والا ہے، میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو بتائیے گا۔“

وہ ایل ایل بی کر چکی تھی، قانون کے دائرے کو باریکی سے سمجھتی تھی تبھی اس کی مدد کے خیال سے اس نے اسے آفر کی تھی جو اب وہ بے حد خوش ہوا تھا۔ اگلے دو روز کے بعد وہ اس سے دوستی کے لیے التجا کر رہا تھا مگر سارہ بنا اسے جانے اس سے بات بھی کرنے کی خواہاں نہیں تھی تبھی اس نے فوری اسے سچ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سارہ کو اس کی سچائی اچھی لگی تھی پھر اپنی اسٹوڈنٹ کے بھائی کا حوالہ بھی قدرے معتبر تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے اس سے بات کرنے کی ہامی بھر لی تھی۔ وہ شخص اس کے مان جانے پر خوش تھا، بے پناہ خوش۔ بالکل کسی چھوٹے سے بچے کی مانند، اس کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

سارہ اب اس کی تصویروں کو نظر انداز نہیں کر رہی تھی، وہ شخص اپنی زندہ دل شخصیت کے سبب اسے دل میں اترتا محسوس ہوتا تھا۔ بات بے بات اس کی نہ رکنے والی ہنسی، شرارتیں اور پھر چھوٹی سی بات پر غصہ ہو جانا، سب بے حد دلچسپ اور انوکھا تھا۔

سارہ کی ہر بات اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی، اس سے بات کرتے ہوئے اس کا اپنا ملازمین کے ساتھ رویہ بھی بہت اچھا رہتا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اس کی شان دار اور دلچسپ شخصیت کی گرویدہ ہوتی گئی۔

سردیوں کے دن تھے اور وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی جب اس روز معمول کے مطابق اس کی کال آگئی۔ روز اس وقت وہ سڑکوں پر بے مقصد گاڑی گھماتے ہوئے اس سے بات کرتا رہتا تھا، کپاس کا سیزن تھا اور چنائی شروع ہو گئی تھی۔

”کیسی ہیں آپ؟“

سارہ کے کال پک کرنے پر اس نے پوچھا تھا۔ اس وقت اس کے لہجے میں پہلے سے زیادہ اپنائیت اور محبت تھی، وہ باتوں میں لگ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چپ ہو گیا تھا۔

”سارہ ایک بات کہوں، آپ ناراض تو نہیں ہوں گی؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بالآخر اس نے پوچھا تھا، وہ چونک اٹھی۔

”ناراض نہ ہونے والی ہوئی تو نہیں ہوں گی۔“

”نہیں... پلیز آپ وعدہ کریں آپ ناراض نہیں ہوں گی۔“ اس کے لہجے میں بہت مٹھاس تھی، وہ مسکرا دی۔

”ٹھیک ہے نہیں ناراض ہوں گی، بتائیے۔“

”کہہ نہیں سکتا، میسج میں لکھ سکتا ہوں۔“ وہ خوش ہوا تھا، وہ پھر ہنس دی۔

”اوکے!“ اسے اندازہ نہیں تھا وہ کیا لکھنے والا ہے مگر پھر بھی اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ ایک منٹ کے بعد ہی میسج بچ اٹھی۔

”I Love U Sooooo Much“

بہت شدت کے ساتھ اس نے لکھا تھا وہ حیران ہی تو رہ گئی، اتنے مختصر ٹائم میں اتنی جلدی محبت...؟

”کیا ہوا آپ چپ کیوں ہو گئیں؟“ اس نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا تھا۔

”نہیں کچھ نہیں، شکریہ آپ کی بے لوث محبت کے لیے۔“

”کیا آپ مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟“

”نہیں، مجھے محبت کرنی نہیں آتی۔“ بہت سنجیدگی کے ساتھ اس نے کہا تھا، دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

”حماد!“ کچھ دیر کے بعد اس نے اسے پکارا تھا مگر وہاں ہنوز خاموشی چھائی رہی۔

”حماد! پلیز بات کرو۔“ وہ پریشان ہوئی تھی۔ تبھی اسے محسوس ہوا جیسے وہ رو رہا ہے۔

”حماد آپ رو رہے ہیں؟“ اب اس کے لہجے میں بے چینی اتر آئی تھی، جواب میں اس کے رونے میں شدت آگئی، وہ سچ مچ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

”حماد کیا ہوا ہے، ایم سوری اگر آپ کو میری بات سے دکھ پہنچا۔“ تبھی کچھ دیر کے بعد وہ بولا تھا۔

”میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ آپ مجھ سے پیار کریں، بہت گندا انسان ہوں میں۔“
 ”نہیں، ایسے مت کہو پلیز۔“

سارہ کو اس کی دل آزاری سے تکلیف ہو رہی تھی، بہت مشکل سے اس نے اسے چپ کروایا تھا، مگر یہ بات اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی، بھلا کوئی مرد کسی عورت کے لیے یوں شدت سے کیسے رو سکتا ہے، بہت مشکل سے اس وقت اس نے اسے چپ کروایا تھا، آنے والے دنوں میں اس کا دل اس شخص کے لیے اور بھی گداز ہوتا گیا تھا، وہ دونوں ہر پل رابطے میں رہنے لگے، گھنٹوں باتیں کرتے رہتے، دونوں کی صبح ایک دوسرے کی یاد سے ہوتی تھی اور رات میں حماد، اس کے ساتھ بات کر کے، ڈرائیو کرتے ہوئے گھر پہنچتا اور پھر وہی اسے سلاتی۔

وہ اس سے اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات شیئر کرتا تھا، خواہ وہ گھر کی ہوتی، زمینوں کی ہوتی دوستوں کی ہوتی یا پھر سیاست کی۔ وہ خود پسندی کا شکار تھا اور اس کی خود پسندی سے اکثر وہ

ہرٹ ہو کر رہ جاتی تھی، ان دنوں اس نے تمام دوستوں سے بھی کنار کشی کی ہوئی تھی، سارہ کی کوشش سے اس کے دوستوں سے بھی اس کی صلح ہو گئی۔

روز بروز وہ اس کی زندگی میں اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی اور اب وہ اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کرنے لگا تھا۔ ایک شخص جو آپ کی پسند کے عین مطابق ہو، اگر وہ محبت اور اہمیت کے ساتھ آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کی خواہش کا اظہار کر دے تو عورت کے لیے یہ بہت بڑی خوشی بن جاتی ہے، وہ بھی دنگ رہ گئی تھی۔

”حماد! کیا آپ کے گھر والے اس شادی کے لیے مان جائیں گے؟“ جانے کس خدشے کے تحت وہ پوچھ بیٹھی تھی، جب وہ بولا۔

”ہوں، میرے گھر والے مجھ پر انحصار کرتے ہیں، ان کو پتا ہے میرا کوئی فیصلہ کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا۔“

”فرض کر لیں اگر وہ نہ مانے تو؟“

”تو کیا میں آپ کے لیے سارے خاندان کو ٹھوکر مار سکتا ہوں، آپ ایک بار کہہ کر تو دیکھیں۔“ ہر بات میں وہ یہی کہتا تھا ”آپ ایک بار کہہ کر تو دیکھیں“ اور پھر واقعی جو وہ

اسے آزمانے کے لیے کہہ دیتی تھی وہ اس پر عمل کر کے دکھاتا تھا، صرف اس کی وجہ سے وہ اپنے ملازمین پر سختی نہیں کرتا تھا، صرف اس کے لیے اس نے کبھی کبھار نماز پڑھنا بھی شروع کر دی تھی گھر بھی جلدی آجاتا تھا، آئے روز گاڑی بھی اس کی پسند کی لیتا، ایک بار اسے ملک شیک پینا تھا، سارہ نے شرارت سے کہہ دیا۔

”آپ چینی کی بجائے نمک ڈلو کر پیئیں تو مانوں۔“

اور جواب میں اس نے فوراً لڑکے کو بلوا کر چینی کی جگہ نمک ڈال لانے کا آرڈر جاری کر دیا، وہ روکتی رہ گئی مگر اس نے نمک والا شیک ہی پیا۔ ایسی بہت سی باتیں تھیں، سارہ کی اسٹوڈنٹ کے بھائی نے بھی اس کی بہت تعریف کی تھی لہذا وہ اس کی شخصیت کے حصار میں کھینچتی چلی گئی۔

اپنے گھر والوں کو بھی اس نے اس کے بارے میں بتا دیا تھا جو اباً انہوں نے اس کی پرسنالٹی کی بہت تعریف کی۔

انہی دنوں حماد نے اسے بتایا کہ وہ فیس بک استعمال کرتا ہے، سارہ کو اس کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی مگر وہ چپ کر گئی تھی۔ دونوں میں اگر بہت پیار تھا تو جھگڑے بھی بہت ہوتے تھے، بے بنیاد سی باتوں

کو لے کر دونوں ایک دوسرے سے الجھ پڑتے۔

حماد نے اس کا ذکر اپنے خاص دوستوں سے کیا تھا اور اس کے خاص دوستوں کے لہجے میں بھی اس کے لیے بہت احترام تھا، اسی چیز نے اسے مزید متاثر کیا تھا۔ سارہ کے پاس حماد کی فیس بک آئی ڈی کا پاس ورڈ تھا اور وہ اکثر اسے چیک کرتی رہتی تھی مگر وہاں فیس بک پر اس کی آئی ڈی میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا، جو اسے اس کی نظروں میں بدکردار ثابت کرتا۔

وہ دوستوں کا دوست تھا، گھر والوں پر اس کا رعب تھا، بھائیوں پر جان دیتا تھا، اپنے مرحوم باپ سے بے حد پیار کرتا تھا، اکثر ان کی باتیں کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتا تھا۔ سارہ کے لیے اس کی یہ سب باتیں متاثر کن تھیں کیونکہ وہ بھی اپنے رشتوں پر جان دینے والی لڑکی تھی۔

ایک چیز جو اسے پسند نہیں تھی وہ اس کا غصہ اور آوارہ مزاجی تھی۔ غصے میں وہ لوگوں کے ساتھ بہت بد لحاظ ہو جاتا تھا اور مہینے میں تین چار بار اس کا لاہور کا چکر ضرور لگتا۔ سارہ کو اس وقت قطعی علم نہیں تھا کہ وہ آئے روز لاہور کیوں جاتا ہے۔

وہ اسے ایک نڈر سچا کھرا انسان سمجھتی تھی جس کی زندگی میں کسی جھوٹ کی گنجائش نہیں تھی مگر حقیقت اس کے الٹ تھی۔

حماد کے بقول وہ لڑکیوں کو لفٹ نہیں کرواتا تھا۔ پھر بھی لڑکیاں خود ہی اس کے نزدیک آکر پھر خود ہی اسے چھوڑ جاتی تھیں۔ اسے اس بات پر بھی بہت ناز تھا کہ اس کی گاڑی جب گرلز کالج کے گیٹ کے باہر رکتی ہے تو کالج کی لڑکیاں دل ہاتھ میں لیے اس کی صرف ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب ہو جاتی ہیں، وہ اس کی اس بات کو جھٹلا نہیں سکتی تھی کیونکہ کالج کی پریوں کے ڈولتے ایمان اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے مگر لڑکیاں اس کے نزدیک آکر پھر اسے چھوڑ کیوں جاتی تھیں، یہ بات اسے الجھا دیتی تھی۔

دونوں کے درمیان نام نہاد محبت کا اڑتا پنچھی آسمان کو چھو رہا تھا۔ حماد کے بقول وہ اس کے لیے اس کی فیملی کا حصہ تھی اور وہ خود اس کو اس کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کو تیار تھا۔

ایک بار سفر کے دوران سارہ نے اس کے کسی دوست کی تعریف کر دی تھی جس پر وہ بہت جذباتی ہوا تھا اس نے سارہ سے کہا کہ وہ اسے اپنی پسند کے قالب میں ڈھالنے کے لیے ایک لسٹ تیار کر کے دے دے جس میں وہ ساری خوبیاں ہوں جو وہ اس میں دیکھنا چاہتی ہے اور جواباً وہ ہنس پڑی تھی کیونکہ اسے وہ اپنی خامیوں سمیت بھی پیارا تھا۔

آئے روز دونوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی بات پر جھگڑا ہو جانا معمول کی بات تھی مگر اس روز جب وہ دوستوں کے درمیان بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اچانک اس کا موڈ بگڑ گیا اور اس کا لہجہ اتنا تلخ ہو گیا کہ سارہ حیران رہ گئی وہ کبھی اتنی پستی میں جا کر بھی بول سکتا ہے اسے گمان میں بھی نہیں تھا۔

پہلی بار اس روز وہ بہت روئی تھی اور اسی روز اس نے نماز میں اللہ رب العزت کے حضور دعا کی کہ وہ اسے ایک نیک اور اپنی پسند کا ہم سفر عطا کرے اس کے حق میں جو بہتر ہے وہ کرے اور اس کی دعا فوراً قبولیت کا درجہ پاگئی۔

اگلے ہی روز اس کی ماں کی ایک چچا زاد بہن کے توسط سے اس کے لیے ایک بہترین رشتہ آگیا، پڑھا لکھا، سلیجھا ہوا لڑکا تھا۔ جس کی شان دار جاب اور چار منگ پر سنالٹی اضافی خوبیوں میں

شمار ہوتی تھی۔ ایک بوڑھی ماں اور ایک چھوٹا بھائی تھا، بہنیں شادی شدہ تھیں، لڑکے کی ماں نے بہت امیر کبیر گھرانوں کی لڑکیاں بھی ری جیکٹ کر دی تھیں مگر سارہ اذہان پہلی نظر میں ہی اس کے دل میں اتر گئی۔

ایک ہفتے بعد اس کی ماما نے لڑکے کو دیکھ کر اوکے کر دیا اور یوں سارہ کا باقاعدہ رشتہ طے ہو گیا۔ اس ایک ہفتے کے دوران اس کا حماد سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ بہترین رشتہ طے ہو جانے کے باوجود وہ خوش نہیں تھی کیونکہ اس کی نظر میں اپنے ہم سفر کے لیے حماد کا نقش ثابت ہو کر رہ گیا تھا۔ تقریباً پندرہ بیس روز گزر جانے کے بعد حماد کے قریبی دوست نے جسے وہ اپنا بھائی مانتی تھی اس سے رابطہ کیا تھا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر اس کا واسطہ تو حماد سے تھا، جسے نہ اپنی بات کا احساس تھا نہ تعلق ٹوٹ جانے کی پروا۔

اسی دوران سارہ نے اپنی منگنی کی خبر اپنی دوستوں کو دے دی۔ اس کی دوست نے جو اس کا فیس بک اکاؤنٹ استعمال کرتی تھی اس کی پروفائل میں اس کا ریلیشن شپ اپ ڈیٹ کر دیا۔ ان کے لیے اپنی عزیز از جان دوست سے متعلق یہ خبر جھوٹی نہیں تھی تاہم حماد نے جب اس کی پروفائل میں یہ پڑھا وہ شاکڈرہ گیا۔ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ اتنے کم وقت

میں ایسا کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ اب سارہ سے رابطہ کر رہا تھا مگر سارہ اپنے سیل سے اس کے تمام نمبر ڈی لیٹ کر چکی تھی تبھی اس نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔

حماد جیسے خود پسند اور گھمنڈی شخص کے لیے یہ شکست بہت بڑی تھی، کسی حد تک شاید اس کے دل کو چوٹ بھی لگی تھی تبھی اپنا حلیہ بگاڑنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے دوستوں کو سارہ کا نمبر دے کر یہ ہدایت کر دی کہ وہ لڑکی کہیں جانے نہ پائے۔

اس کے انہی دوستوں میں ایک دوست کا مران تھا، جو اس کی ٹکر کی کاسٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ حماد کی اس کے ساتھ لڑائی ہو گئی، لہذا اس نے سارہ سے رابطہ کر کے حماد کی ساری حقیقت اس پر کھول دی۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ اپنے تمام آوارہ دوستوں میں بیٹھ کر بڑے مزے کے ساتھ اس کی باتیں کیا کرتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے تمام دوستوں کو اس کی تصویر بھی دکھائی ہے، اسی نے اپنے دوستوں میں اس کا نمبر بانٹا تا کہ اسے تنگ کیا جاسکے۔

مزید یہ کہ اس کی زندگی میں کوئی لڑکی کبھی نہیں ٹھہر سکتی، وہ بھونرا ہے اور لڑکیوں کو پھول سمجھ کر ان کا رس چوستا ہے، ان کا ایک دوست علیم تھا جو اکیلا رہتا تھا، اس کے گھر کی چابی حماد کے پاس ہوتی تھی اور وہ آئے روز جو لڑکی بھی اس کے ہاتھ چڑھتی اس کی عزت

روندنے کے لیے اسے وہاں لے جاتا اور یوں اپنے جذبات ٹھنڈے کرتا، اپنی غلط حرکتوں کی وجہ سے ہی اس پر مختلف قسم کے کئی کیس بنے تھے، سارہ سنتی جاتی تھی اور شکاڈ سے روتی جاتی تھی۔

محبت کے نام پر یہ دھوکا نیا نہیں تھا مگر چوٹ ضرور نئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا سادہ سادہ کسی طور حماد کے دوست کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا تبھی اس کے دوست نے اس کے یقین کے لیے اسے اس کی فیس بک آئی ڈی چیک کرنے کا مشورہ دیا، حماد اپنا سابقہ پاس ورڈ جو اس نے خود اسے دیا تھا، تبدیل کر چکا تھا، پھر بھی وہ اس کا نیو پاس ورڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی، جس روز اس نے پہلی بار اس کا اکاؤنٹ چیک کیا اسے لگا جیسے کسی نے اس کا وجود بم سے اڑا دیا ہو، کیا کچھ سامنے نہیں آیا تھا۔

جس شخص کو اس نے دوسرے لڑکوں سے مختلف سمجھا تھا، وہ صرف عیاش، شرابی اور زانی ہی نہیں مردہ ایمان کا حامل بھی نکلا تھا۔ اپنی دوست اور حسن کے بل بوتے پر اس نے جن لڑکیوں کا جسم حاصل کیا تھا ان کی تصویریں اپنی آئی ڈی میں خفیہ لگا کر ان پر نہایت گھٹیا کمینٹس بھی پاس کر رکھے تھے۔ اپنی آئی ڈی میں ایڈ کتنی ہی ایسی لڑکیاں تھیں جن سے وہ

گڑ گڑا کر دوستی کی بھیک مانگ رہا تھا، مگر وہ لڑکیاں بولڈ ہونے کے باوجود اسے جوتے کی نوک پر نہیں رکھ رہی تھیں۔

سارہ کے جاننے والوں میں ایک لڑکی عقیفہ تھی، جس کی بڑی بہن سے اس کا خاصا جھگڑا چلا تھا۔ اس سے بھی اس کا پہلے معاشقہ اور پھر جھگڑا شروع ہو گیا تھا، اس کے پیچھے دن رات پاگلوں کی طرح وہ اس کے گھر کے چکر بھی لگا رہا تھا، وہ کب گھر سے نکلتی ہے، کہاں جاتی ہے، کیا پہنتی ہے، اسے سب پتا تھا اور وہ اسے بتا بھی رہا تھا۔

ایک لڑکی لاہور کی تھی نازیہ! جس کے لیے اس کی جان لبوں پر آئی ہوئی تھی، اس سے دوستی کو اس نے زندگی موت کا مسئلہ بنا لیا تھا۔

اس کے دوست نے کہا تھا کہ وہ لڑکیوں کا شیدا ہے، اس نے کبھی کسی شہر کی لڑکی نہیں چھوڑی مگر... اس نے یقین نہیں کیا تھا، تاہم اب حقیقت اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اس کے اکاؤنٹ کے ان بکس میں، اس کے ایک دوست کے نام وہ اسی کے ہاتھوں سے ٹائپ لفظ پڑھ رہی تھی جس میں اس نے خود لکھا تھا کہ وہ چار روز کے بعد صبح کے چار بجے گھر واپس آیا ہے۔

اپنے دوست کے یہ پوچھنے پر کہ وہ کہاں تھا اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنی ایک گرل فرینڈ کو لے کر شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ چار دن صبح و شام بہت مزے کیے ہیں۔ اس نے اس لڑکی کو دوبارہ کسی لڑکے کے استعمال کے قابل نہیں چھوڑا تھا، اس کا دوست اس کی قسمت پر رشک کر رہا تھا اور ادھر سارہ کا دل تھا کہ ڈوبتا ہی جا رہا تھا۔

وہاں کوئی ایک داستان تو نہیں تھی، اس شخص کی بدکرداری اور بے ایمانیوں کا پورا باب درج تھا، سارہ کو لگا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہو، اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اس روز وہ اپنی سادگی اور حماقت پر بہت روئی تھی اسے اب تک انسانوں کی پرکھ نہیں ہو سکی تھی۔

اگلے روز وہ اپنی اسٹوڈنٹ کے بھائی سے جھگڑا کر رہی تھی اور وہ اسے بتا رہا تھا۔

”میں اسے چھوڑ چکا ہوں، آپ کی طرح میں بھی اس کی اصلیت سے بے خبر تھا مگر لاہور وزٹ کے دوران میں نے جو دیکھا، اس کے بعد مجھے اس سے نفرت ہو چکی ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہ رہا تھا مگر نہیں بتا سکا۔ آپ میرا یقین کریں میں نے اسے ہر گز آپ کا نمبر نہیں دیا بلکہ

اس نے خود میرے سیل سے آپ کا نمبر لیا، پھر بھی میں بہت شرمندہ ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے معاف کر دیجیے گا۔“

اس نے اپنا معاملہ کلیئر کر لیا تھا مگر جو دھچکا سارہ کے دل کو لگا تھا، ابھی اس کا اثر زائل ہونے والا نہیں تھا۔ حماد کے دوست اسے تنگ کر رہے تھے، اس نے اپنا نمبر بدل لیا مگر پھر بھی سکون تھا کہ جیسے رخصت ہی ہو گیا تھا۔

...☆☆☆...

رات کے سوا دو بجے کا ٹائم تھا جب وہ تھکن سے نڈھال گھر میں داخل ہوا۔ صدف اس وقت کچن میں مصروف تھی۔ وہ سرسری سی ایک نظر اس پر ڈالتا آف موڈ کے ساتھ اوپر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ کمرے میں آئی تو اشعر لباس تبدیل کرنے کے بعد ٹی وی کے سامنے بیٹھا جانے کوں سی ڈا کو منٹری فلم دیکھ رہا تھا۔ وہ گیلے ہاتھوں کو دوپٹے سے خشک کرتی چپ چاپ بیڈ کے کونے پر ٹک گئی۔

”کھانا لائوں آپ کے لیے؟“

”نہیں!“

”کیوں! میرا مطلب ہے آج میں نے آپ کی پسند کے جائیز رائس بنائے ہیں۔“

”تو...؟ کھانا کھا کر آیا ہوں میں۔“

باہر بگڑے موسم کی طرح اس کا موڈ بھی بے حد خراب تھا۔ وہ دل برداشتہ سی اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔ باہر اب تیز بارش ہو رہی تھی۔ وہ بھاگ کر صحن میں پھیلے کپڑے تار سے اتار کر سمیٹنے لگی تاہم اس کوشش میں خود اس کا پور پور بھیگ گیا تھا۔

”بھابی...!“ بریرہ اب اس کی جگہ کچن میں تھی، صحن میں اس کی موجودی کی آہٹ پا کر وہ بھی صحن میں آگئی۔

”بھائی آگئے؟“

”ہوں!“

”دو بج گئے ہیں، پچھلے ایک ماہ سے وہ مسلسل لیٹ گھر آرہے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے“

”بھابی!“

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ وہ شکڈ سے پلٹی تھی جواب میں بریرہ نے نظر چرائی۔

”آپ کا قصور...؟ پتا نہیں!“

بات ادھوری چھوڑ کر وہ پلٹ گئی تھی، صدف وہیں صحن کے بیچ و بیچ کھڑی بھیگتی رہی۔ اس کی آنکھیں برسنے کو تیار تھیں مگر وہاں تیز بارش نے اس کے آنسو نگل لیے تھے۔ جانے کیسے وہ خود کو سنبھال کر دوبارہ کمرے میں واپس آئی تھی تب تک اشعر اپنے روزمرہ کی ڈیوٹی شروع کر چکا تھا۔ بیڈ پر اس کی طرف سے کروٹ بدلے وہ سیل فون کان سے لگائے اب ساری رات اپنی گرل فرینڈ سے معاشقہ جھاڑنے والا تھا۔

صدف سرسری سی ایک نظر اس پر ڈالتی باہر ٹیرس پر چلی آئی۔ بارش کی تیزی میں اب کمی آچکی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش کے ساتھ بخ بستہ ہوانے اس کے اندر کی گھٹن کو خاصی حد تک کم کر دیا تھا۔ تبھی وہ پلٹی تھی اور دوبارہ کمرے سے ملحقہ اسٹڈی روم میں چلی آئی، کل اس کے ہاتھ اشعر علی احمد کی پرسنل ڈائری لگی تھی جسے مصروفیت کے باعث وہ پڑھ نہیں سکی تھی مگر آج رات اسے صبح تک اسی ڈائری کا مطالعہ کرنا تھا۔

...☆☆☆...

آدھی رات کا وقت تھا۔

گائوں کے قرب و جوار میں سوائے جھینگروں کے شور مچایا مینڈکوں کے ٹرانے کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تاہم پھر بھی وہ بے چین تھی، اس کی پیاسی ممتا کے کان کسی ننھے سے بچے کے بلکنے کی آواز پر لگے تھے اور وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔

ساتھ والی چار پائی پر اس کا مجازی خدادن بھر کی تھکن کے بعد اب پر سکون نیند کے مزے لے رہا تھا مگر اسے سکون نہیں تھا، تبھی بے کل ہو کر وہ اپنے شوہر کی چار پائی پر جھکی تھی۔

”بشیرے... او بشیرے!“

بشیرے کی آنکھ اس کی مسلسل پکار پر کھلی تھی۔

”کیا ہے؟“

”مجھے نیند نہیں آرہی، مجھے لگتا ہے جیسے پاس میں کوئی بچہ رو رہا ہے۔“

”وہ تو روز لگتا ہے تجھے، احمد کی مرگ کے بعد یہ بات تو معمول بن گئی ہے، سو جا چپ

کر کے۔“

”نہیں بشیرے! اس باریہ آواز میرا وہم نہیں ہے، کوئی بچہ تو ہے تو چلنا میرے ساتھ دیکھ آتے ہیں۔“

”تو پاگل ہو گئی ہے زلیخا! عقل سٹھیا گئی ہے تیری اور کچھ نہیں۔“ بشیرا بڑبڑاتے ہوئے بستر پر اٹھ بیٹھا تھا، وہ مزید لجاجت سے کام لینے لگی۔

”میں کملی سہی پر تجھے سوہنے رب کا واسطہ، بس ایک بار میرے ساتھ چل۔“

وہ منت کر رہی تھی بشیرا اتنے بڑے واسطے پر بادل خواستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ قریب ہی رسوئی کے آلے میں لالٹین جل رہی تھی۔ اٹھا کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا، زلیخا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ اس کا دل اس لمحے بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

آواز فصلوں کے اس پار قریبی مسجد سے آرہی تھی، وہ دونوں اسی طرف بڑھ گئے۔ کچھ ہی فاصلہ طے کرنے پر انہیں بچہ نظر آ گیا تھا۔ مسجد کے باہر سیڑھیوں پر پڑا بلکتا ہوا وہ ننھا وجود اس وقت کئی خوانخوار کتوں کے حصار میں تھا جو بس اسے بھنبھوڑنے ہی والے تھے، اس نے بے تابی سے اس ننگ دھڑنگ ننھے وجود کو اٹھا کر اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔

کتے بشیرے کی لکار پر بھاگ گئے تھے، وہ رو پڑی۔

”دیکھا میں نے کہا تھا ناں بشیرے! میرے سوہنے رب نے میری بے چین ممتا کی تسکین کے لیے اپنا خاص کرم فرمادیا ہے، وہ زلیخا کو جانتا ہے اس کے اندر کو پہچانتا ہے، اسے زلیخا بُری نہیں لگتی۔“

ننگ دھڑنگ بچے کو سینے سے لگائے وہ روتی جاتی تھی اور بولتی جاتی تھی، بشیر ابالکل ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

اگلے روز دن کے اجالے میں گائوں میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی۔

سب بچے کے بارے میں متجسس تھے مگر کوئی بھی اس بچے کی ماں کے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ وہ ظالم عورت کون تھی اور کہاں گئی۔

بچہ ابھی صرف چند دنوں کا دکھائی دے رہا تھا، زلیخا کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

اسے گھر کے سارے کام ہی بھول گئے تھے، بس وہ بچہ یاد رہا تھا، گورے چٹے رنگ اور

خوب صورت نقوش کا حامل وہ بچہ اسے اپنی کوکھ سے پیدا ہونے والے بچے کی طرح ہی پیارا

لگ رہا تھا۔ بشیر اسے خوش دیکھ کر ہی خوش ہوتا رہا۔

اگلے روز اسے شہر میں ڈیوٹی پر واپس جانا تھا، وہ مسرور سازلیخا کو اپنا اور بچے کا خیال رکھنے کی ہدایت دیتا شہر واپس پہنچ گیا۔ جس بنگلے میں اس کی چوکیدار کی نوکری تھی اس بنگلے کی مالکن بھی اس رات اسپتال میں داخل تھی، اس کی شادی کو بھی پندرہ سال ہو گئے تھے، پندرہ سال بعد جب اس نے ماں بننے کی امید چھوڑ دی تھی اللہ نے اسے باامید کر دیا تھا۔ بنگلے میں اس رات صرف چند افراد کے تھے باقی سب اسپتال میں تھے، وہ چپ چاپ اپنے کوارٹر میں آکر لیٹ گیا۔

اگلے روز اس نے بنگلے میں کھرام دیکھا تھا۔ بنگلے کی مالکن زندہ بچے کو جنم نہیں دے سکی تھی، ہوش آنے کے بعد اس نے بچے کو دیکھنا چاہا تھا مگر... ڈاکٹرز کے مطابق وہ خطرے سے باہر نہیں تھی، دوبارہ ہوش میں آنے کے بعد اس کے پاس کسی بچے کا ہونا لازمی تھا وگرنہ اس کے اعصاب پر شدید دباؤ کے سبب اسے کسی بھی قسم کا خطرہ پہنچ سکتا تھا

بشیرے کے علم میں یہ بات آئی تھی اور وہ خاصی پریشانی میں دیر تلک خود سے الجھنے کے بعد بنگلے کے مالک کے پاس چلا آیا تھا۔

”سلام صاب!“

”وعلیکم السلام بشیر احمد! آگئے واپس؟“

”جی صاب! کل شام ہی واپسی ہوئی ہے، بیگم صاحبہ کے بارے میں پتہ لگا تو آپ کے پاس چلا آیا۔“

”ہوں، ابھی وہ ہوش میں نہیں ہیں، جانے کب انہیں ہوش آجائے، اس سے پہلے پہلے کسی بچے کا انتظام ہونا ضروری ہے، نہیں تو وہ مرجائیں گی۔ میں بچہ ایڈاپٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، مگر اتنا چھوٹا بچہ فوری ملنا مشکل ہے، کوئی ماں یہ قربانی نہیں دے سکتی۔“ وہ پریشان تھے، بشیر نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر نظر جھکا لی۔

”آپ چاہیں تو میری بیوی یہ قربانی دے سکتی ہے صاب!“

اس کے منہ سے ایسی بات نکلی تھی کہ بنگلے کا مالک حیران رہ گیا تھا۔ بشیر احمد نے پرسوں رات والی ساری بات اس کے گوش گزار کر دی، جسے سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

”پتا نہیں کس کا بچہ ہو، جائز ہو کہ ناجائز ہو، پھر تمہاری بیوی بھی تو ممتا کی پیاسی ہے، وہ کیسے تمہیں یہ قدم اٹھانے دیں گی۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں صاب! وہ میری فرماں بردار ہے، بیگم صاحبہ کی زندگی کا سوال نہ ہوتا تو شاید میں ایسا کبھی نہ سوچتا۔“

”ہوں، مجھے تو اسی کی فکر ہے بشیر احمد! پندرہ سال کا ساتھ ہے ہمارا، میں کسی صورت اسے کھونے کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔“

”تو پھر آپ اجازت دیں صاب! میں آج شام ہی بچے کو لے آتا ہوں۔“

بشیر نے ایک مشکل کام کے لیے اجازت چاہی تھی اور اسے اجازت مل گئی تھی، بنگلے کے مالک نے کچھ دیر سوچ بچار کے بعد دھیرے سے سر ہلا کر اسے رخصت کر دیا۔ وہ عصر سے کچھ پہلے گھر واپس آیا تو بچے کو دودھ پلا کر سلاتی ہوئی زلیخا حیران رہ گئی۔

”بشیر احمد تو... سب ٹھیک تو ہے ناں؟“

مگر وہ چپ رہا تھا، اس نے زلیخا کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

”کا کا کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے پر تو واپس کیسے مڑ آیا؟“

وہ ابھی تک اسے ان سمجھ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، اس نے نظر پھیر لی۔

”تجھ سے کچھ لینے آیا ہوں زلیخا!“

”مجھ سے...؟ اللہ خیر کرے بشیرے! میں نمائی تجھے کیا دے سکتی ہوں؟“

”کاکا...!“ اس کے منہ سے نکلا تھا اور زلیخا کا دل دھک سے رہ گیا۔

”کاکا... مگر کیوں؟“

”کیوں کہ وہ تیرا نہیں ہے۔“

”ایویں میرا نہیں ہے، میرے سوہنے رب نے دیا ہے مجھے، اس کے گھر کی سیڑھیوں سے

اٹھا کر لائی ہوں میں اسے۔ اس نے سنی ہے زلیخا کے دل کی، کیسے میرا نہیں ہے وہ۔“

”پاگل پن کی باتیں مت کر زلیخا! وہ بیگم صاحبہ کا بیٹا ہے، ان کی ملازمہ اسے بنگلے سے چرا کر

بھاگ آئی تھی مگر کتوں سے ڈر کر مسجد کی سیڑھیوں پر چھوڑ گئی۔“

ڈپٹ کر بولتے ہوئے اس نے وہ کہانی سنا دی تھی جسے وہ سارے رستے سوچتا آیا تھا۔ زلیخا کے

چہرے کا رنگ بدل گیا۔

”میں نہیں مانتی کسی بات کو، میں نے اس کی پکار سنی تھی، اگر میں وقت پر اس تک نہ پہنچتی

تو وہ کتوں کا نوالہ بن چکا ہوتا، جا جا کر کہہ دے اپنی مالکن سے، زلیخا متا پر سمجھوتا نہیں

کرے گی۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، تیرے لیے اس گھر میں بھی کوئی گنجائش نہیں ہے، میں تجھے طلاق دے

کر ہمیشہ کے لیے شہر جا رہا ہوں۔“

اس بار بشیرے کے منہ سے نکلے الفاظ نے اسے ساکت و جامد کر دیا تھا۔ وہ ہلنے کے قابل بھی

نہیں رہی تھی، پچیس سال کا ساتھ ایک لمحے میں دائی پر لگ گیا تھا۔

اگلے بیس منٹ میں بشیر بچے کو پالنے سے نکال کر لے گیا، پیچھے وہ ساکت و جامد اپنی اجڑی گود

کے ساتھ بیٹھی رہ گئی تھی۔

اگلے تین روز تیز بخار نے اس کی مت مار کر رکھ دی، خدا خدا کر کے بخار ٹوٹا تو لبوں پر مستقل

چپ نے ڈیرہ ڈال لیا۔ بشیر اسے دلا سے دے کر سمجھانے کی کوشش کرتا مگر وہ کچھ سمجھتی اور

سنی ہی نہیں تھی۔ ایسے ہی ایک روز صبح بشیرے کی آنکھ کھلی تو زلیخا کو بستر میں دبکے پایا، وہ

صبح خیز تھی، نماز پڑھتی تھی، اس نے کبھی شدید مشکل اور تکلیف میں بھی نماز نہیں چھوڑی تھی، مگر اس روز وہ نہیں اٹھی تھی۔

بشیر احمد نے بستر سے نکل کر اسے آواز دی تھی، جگانے کی کوشش بھی کی مگر وہ نہیں اٹھی۔ لبوں پر دائی چپ کا قفل لگائے، وہ اس کے آزاد کرنے سے قبل خود ہی اسے آزاد کر گئی تھی۔ کیسا ناقابل یقین منظر تھا۔

کیسی صابر اور خود دار عورت نکلی تھی وہ، اس نے چیخنا چاہا مگر آواز اس کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی، وہ چلی گئی تھی اور بشیر احمد کے لیے اب پیچھے صرف پچھتاوے تھے۔

...☆☆☆...

شام کا وقت تھا، حماد اس وقت اپنے ایک قریبی دوست کے ڈیرے پر بیٹھا اسے نئی پھنس جانے والی لڑکی کی کہانی سنارہا تھا، جب اس کے دوست نے کہا۔

”بہت ہو گئی یار! اب بند کر یہ کھیل اور کسی ایک کا ہو جا۔“

”ہا ہا... کوئی اس قابل تو ہو، یہ دو ٹکے کی کمزور ایمان والی لڑکیاں میری بیوی بننے کے قابل نہیں ہیں، میری شادی تو خاندان میں ہی ہو گی۔“

”جب تجھے پتا ہے کہ تُو نے خاندان میں شادی کرنی ہے تو پھر دوسری لڑکیوں کے ایمان کیوں خراب کر رہے ہو؟“

”میں تھوڑی کر رہا ہوں، لڑکیاں خود اپنا ایمان ہتھیلی پر لیے پھر رہی ہیں۔“ وہ ہنس رہا تھا اس کے دوست نے سر جھٹک دیا۔

اگلے چند دنوں میں واقعی اس کی بات اس کی پسند سے طے ہو گئی تھی، لڑکی صوم و صلوٰۃ کی پابند تھی اور پردے کے معاملے میں بہت سخت تھی، حماد نے اسے خاندانی تقریب میں ایک نظر دیکھا تھا اور بس اسے اوکے کر دیا تھا۔

اس کے دوستوں نے اس کی اس خوشی کو بہت دھوم دھام سے سلبریٹ کیا تھا، اگلے دو ماہ کے بعد اس کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی، وہ خوش تھا بے پناہ خوش... شادی کی شاپنگ کرتے ہوئے اکثر سارہ اذہان کا خیال اسے پریشان کر دیتا تھا کیونکہ اس نے واقعی اس کے حوالے سے کچھ خواب دیکھے تھے، تاہم وہ اس کی نہیں ہو سکی تھی۔

قطعی غیر متوقع طور پر اس کی منگنی کی خبر نے اسے بہت ہرٹ کیا تھا، اسے ذہن سے جھٹکنے میں اسے وقت لگا تھا مگر بہر حال وہ اب اس کے خوابوں سے باہر نکل آیا تھا۔ پیسہ، وقت، تقدیر سب اس کی مٹھی میں تھے، وہ اپنی زندگی کو یادگار بنانا چاہتا تھا بالکل ویسے ہی جیسے اس کا پسندیدہ قلعہ دراوڑ اس کے لیے یادگار تھا۔

کیا کچھ نہیں کیا تھا اس نے اپنی شادی کے لیے مگر وہ بھول گیا تھا کہ بددعائیں جن کا پیچھا کرتی ہوں، وہ کبھی دنیا اور آخرت میں سرخرو نہیں ہو پاتے۔

ایک ماہ پہلے ہی اس کی شادی کی تیاری شروع ہو گئی تھی، دوست یا سب اس کی خوشی میں پاگل اپنا اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے شادی والا دن بھی آ گیا۔ حماد نے سوچ لیا تھا کہ اب آگے اسے اپنی زندگی کیسے لے کر چلنی ہے، اپنی بیوی کو کیا حقوق دینے ہیں اور کن سے محروم رکھنا ہے۔ اپنی شادی کے لیے اس نے ایک ایک چیز خود تیار کی تھی، دل کھول کر پیسہ خرچ کیا تھا۔

مہندی والے روز جو تقریب ہوئی تھی اس نے پورے شہر کی آنکھیں کھول کر رکھ دیں۔ شب عروسی کے لیے اس نے کرتا شلواری پر تلے دار کھسہ پہنا تھا۔ عورت ذات کو ہمیشہ مسلنے

کچلنے کے باوجود اس وقت اس کے کمرے میں بیٹھی وہ لڑکی اس کے لیے ایک نیا دل چسپ باب تھی کیونکہ وہ اس کے خاندان سے تھی، پاکیزہ اور ان چھوٹی تھی اس کے لیے، تبھی اس کا دل اس کے لیے دھڑک رہا تھا۔ خوب صورتی اور دلہنا پے نے اسے حماد کے لیے اور بھی دلچسپ بنا دیا تھا۔ وہ دیر تک اس کا ہاتھ تھامے اس سے ڈھیر ساری باتیں کرتا رہا تھا۔ اس وقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کو جو پہلے اس کی کزن اور اب بیوی تھی، کھا جائے۔

رو مینس میں اسے جنگلی انداز ہی پسند تھا۔ تبھی دھیرے دھیرے دونوں کے درمیان شرم و حیا کے پردے گرتے گئے، اس نے منہ دکھائی میں اپنی بیوی کو گولڈ کاسیٹ، اسی ہزار کا موبائل اور ایک ڈائمنڈ رنگ گفٹ کی تھی اور اب وہ اسے اپنا آپ گفٹ کرنے جا رہا تھا۔ وقت جیسے جیسے گزرتا جا رہا تھا اس کی بے تابیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور پھر جیسے سب کچھ ختم ہو گیا۔

وہ بربادی جو وہ اپنی دولت اور حسن کے بل بوتے پر دوسروں کے نصیب میں لکھتا آیا تھا، اسی بربادی نے ایک زبردست شاک کی صورت اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ دوسروں کی عزتیں

حق سمجھ کر رولتا آیا تھا اور وہاں اس کی عزت جسے اس نے بڑی ہوشیاری سے چھان پھٹک کر پسند کیا تھا، کسی اور کے ہاتھوں بہت بے دردی کے ساتھ رولی جا چکی تھی۔ دو ماہ کے حمل کے ساتھ اس کی بیوی اس وقت اگر جذبات کے زیر اثر نہ ہوتی تو یقیناً شرمندہ ہوتی۔

ایک چال وہ تقدیر کے ساتھ چل کر آیا تھا اور اب ایک چال تقدیر بنانے والے نے اس کے ساتھ چلی تھی۔ اسے تو شاید گمان بھی نہیں تھا کہ انصاف کرنے والا رب بے خبر نہیں ہے۔ اس وقت اسے

کمرے کی ہر چیز خود پر ہنستی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کا گفٹ کیا گولڈ کاسیٹ، ڈائمنڈ کی رنگ، موبائل، قیمتی لباس، ہر چیز بے ساختہ اس وقت اس کا اپنا فخریہ لہجہ ہی اس کی سماعتوں میں گونجتا تھا۔

”ہا ہا ہا... کوئی اس قابل تو ہو“ یہ دو ٹوکے کی کمزور ایمان والی لڑکیاں میری بیوی بننے کے قابل نہیں ہیں، میری شادی تو خاندان میں ہی ہوگی۔“

اس نے زندگی بھر خود کو نفیس رکھا تھا، اس کے ہاتھوں پر اگر گرد بھی پڑ جاتی تھی تو جب تک وہ ہاتھ دھو نہیں لیتا تھا اسے چین نہیں آتا تھا۔ اپنی گاڑی کو وہ اتنا صاف رکھتا تھا کہ کبھی

بھولے سے بھی اس پر گرد پڑی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ ہاتھ لینے کے لیے واش روم میں گھستا تو دو تین گھنٹے جسم پر پانی بہانے کے باوجود مطمئن نہیں ہوتا تھا اور اب... وہ آئینے میں خود اپنا چہرہ دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ کیا وہ تقدیر کے اس مذاق کو اپنے دوستوں کے ساتھ فخریہ شیر کر سکتا تھا؟

تقدیر کا انصاف اور تمانچا اس سے بڑھ کر ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ رات کی تاریکی میں مسجد کی سیڑھیوں پر بچہ رکھ کر خود اندھیروں کی گود میں اتر جانے والی سفاک عورت کوئی اور نہیں اسی حماد کی خاندانی بیوی تھی۔

...☆☆☆...

ڈائری ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی مگر اس کی آنکھیں ضرور جلنے لگی تھیں۔

اشعر علی نے یہ کس کی کہانی لکھی تھی، مسجد کی سیڑھیوں پر دھرے اس بچے سے اس کا کیا تعلق تھا، زلیخا کون تھی؟ بشیرے کا کردار کیا تھا؟ وہ ابھی گہری سچ میں ڈوبی انہی سوالوں کے سرے ڈھونڈ رہی تھی کہ اچانک وہ اسٹڈی میں چلا آیا۔

صدف کی گود میں اس کی پرسنل ڈائری تھی، تبھی شعلے برساتی نگاہوں کے ساتھ وہ آگے بڑھا اور جھپٹ کر ڈائری اس سے چھینتے ہوئے اس پر تھپڑوں کی برسات کر دی۔

”کس نے اجازت دی تمہیں میری پرسنل چیزوں کو ہاتھ لگانے کی، بولو؟“ پہلی بار وہ اس پر ہاتھ اٹھا رہا تھا۔ صدف پے درپے پڑنے والے تھپڑوں کے وار سے سنبھل ہی نہ سکی۔

ایسا کیا تھا اس ڈائری میں جس نے اس شخص کو اتنا جذباتی کر دیا تھا؟

وہ سوچ رہی تھی اور ادھر بھر پور تھپڑ کی ضرب نے اس کے نچلے ہونٹ کے کنارے کو زخمی کر دیا۔ اگلے روز وہ بنا کسی کو بتائے اپنا سامان سمیٹ کر میکے چلی آئی۔

شادی سے لے کر اب تک اس نے اشعر کی بے اعتنائی سہی تھی، پہلی رات سے لے کر اب تک وہ اس سے بیگانہ تھا۔ وہ جب بیاہ کر اس کے گھر آئی، وہ گھر کسی میدانِ جنگ سے کم نہیں تھا مگر یہ وہ تھی جس نے اپنی خد متوں اور قربانیوں سے اس گھر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا۔

صبح سے لے کر رات گئے تک وہ اکیلی کام میں لگی رہتی تھی۔ صبح فجر کی اذان کے ساتھ بیدار ہو کر نماز اور قرآن پاک کا فرض ادا کرنے کے بعد وہ کچن میں گھستی تھی اور پھر سب کی پسند کا علیحدہ علیحدہ ناشتہ تیار کر کے ان کے کمروں میں پہنچاتی۔

وہ سارہ اذہان کی بیٹی تھی اور اسے زندگی کو چیلنج سمجھ کر قبول کرنے میں مزہ آتا تھا۔ اشعر علی کے گھر میں دو خاندان آباد تھے۔ ایک اس کا اپنا اور ایک اس کے تایا کا، دونوں گھرانوں کے افراد کی چونچیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔

اشعر لوگ دو بھائی اور ایک بہن تھے۔ گھر میں اس کی ماں اور بہن دونوں کا پیار اس کے بھائی کے لیے تھا، وہ تو محض ایک ضرورت کی چیز سی اہمیت رکھتا تھا۔ باپ کا رویہ بھی بہت نارمل سا تھا۔ وہ اس چیز پر کڑھتی تھی مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

اشعر کی شادی سے پہلے اس کی تایا زاد کزن نے جسے وہ دل ہی دل میں پسند کرتا تھا، اس پر ریپ کا الزام لگانے کی کوشش کی تھی۔ جس نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ بہت سالوں تک وہ گھر سے دور پرانے دیسوں کی خاک چھانتا رہا تھا۔ شادی کے بعد جب صدف اس کے گھر میں اپنا مقام بنا چکی تھی تب اسے پتا چلا تھا کہ اشعر کی تایا زاد کزن نے صرف اشعر کے بھائی کو اپنا نے کے لیے اس کی بے ضرر ذات پر یہ الزام لگایا تھا کیونکہ اس کا باپ اشعر کے ساتھ اس کی شادی کی بات کر رہا تھا جو وہ ہر گز نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس نے اشعر کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس گھر میں اشعر کی حیثیت بہت ثانوی ہے مگر پھر بھی اسے اس سے

محبت ہو گئی تھی، باقی گھر والوں کے ساتھ ساتھ وہ اشعر کی ضرورتوں کا بھی بہت خیال رکھتی تھی مگر وہ شخص اسے کبھی نہیں سمجھ سکا تھا۔

...☆☆☆...

صدف گھر چھوڑ کر جا چکی تھی۔

وہ کتنی ہی دیر ایک ہی پوزیشن میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا، خالی خالی سی نگاہوں سے اسکرین کو تکتا رہا تھا جیسے روشن اسکرین پر حرکت کرتی تصویروں کے کام کو سمجھنا چاہتا ہو مگر وہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ سارے کردار جیسے گونگے بہرے ہو گئے تھے۔

اسے یاد آرہا تھا، یاد کیا اسے کبھی بھولتا ہی نہیں تھا کہ جب اس نے ہوش سنبھالا تو کتنی محبتیں تھیں جو اس کے گرد خوشبو کی طرح پھیلی تھیں۔ اس کی ماں اس کے ناز اٹھاتے نہیں تھکتی تھی۔ باپ ہر فرمائش

پلک جھپکنے میں پوری کرتا، گھر میں دولت کی فراوانی تھی، نوکر چاکر تھے۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔

ان دنوں وہ میٹرک میں تھا جب ایک روز اچانک تائی سے اس کی مڈ بھیڑ ہو گئی، بات بہت معمولی تھی مگر وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھیں۔

”اپنی اوقات دیکھی ہے تو نے، گندی نالی کا کیڑا ہے تو۔ فیروزہ کے پیٹ سے جنم نہیں لیا تو نے بلکہ کچرے کے ڈھیر سے ملا تھا بشیر احمد نے لا کر یہ گند کی پوٹلی فیروزہ کی جھولی میں ڈال دی، آیا بڑا میرے منہ لگنے والا۔“

حقیقتیں ہمیشہ تلخ ہوتی ہیں مگر کچھ حقیقتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو بدن سے سارا لہو نچوڑ کر رکھ دیتی ہیں، وہ بھی تائی ماں کے اس طعنے پر ساکت و جامد رہ گیا تھا۔ اس وقت نا اس کی سماعتیں کام کر رہی تھیں نہ بصارتیں... اسے صرف اتنا پتا تھا کہ وہ گھر سے نکل گیا تھا اور گھر میں دوبارہ اس کی واپسی فیروزہ بی بی کے نروس بریک ڈائون کی اطلاع پر ہوئی تھی وہ زہر جو تائی نے اس کی سماعتوں میں انڈیلا تھا۔ اس کی مہربان ماں کی زندگی کو اس زہر نے چاٹ لیا۔ جس راز سے وہ اب تک بے خبر تھیں، وہ راز افشاء ہو کر ان کی زندگی کو نگل گیا تھا، فوراً سے پیش ترا نہوں نے بشیرے کو بلایا تھا اور بشیرے نے ان کے غصے کے ڈر سے سب سچ اگل دیا۔

قیامت سی قیامت تھی، انہیں ابھی تک پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ زندگی میں دوبارہ ماں بننے کی صلاحیت کھو چکی تھیں۔ یہ دردناک انکشاف بھی تو ابھی ہوا تھا کہ وہ جس بچے کو اپنا خون سمجھ کر سینے سے لگا کر پالتی رہی تھیں وہ ان کا اپنا خون نہیں تھا۔

سچ کھل کر سامنے آجانے کے باوجود انہیں اشعر سے محبت تھی مگر... ان کی زندگی وفا نہیں کر سکی تھی۔ نروس بریک ڈائون کے ساتھ ہی ان کی موت ہو گئی تھی اور یہیں سے اشعر کی زندگی کے بُرے دن شروع ہو گئے۔

گھر میں سب نے اسے جیسے اچھوت سمجھ لیا تھا۔ انہی دنوں اس کے والد گائوں سے اپنے دوست کی بیوی کو لے آئے۔ فیروزہ بیگم کی طرف سے اولاد کی نعمت سے مایوس ہو کر چند سال قبل ہی انہوں نے گائوں میں خفیہ شادی کر لی تھی اور اب گھر میں ایک عورت کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے وہ اس دوسری عورت کو گھر لے آئے۔ اشعر کے لیے یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا تبھی وہ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اپنے باپ سے الجھ پڑا مگر ایک بار پھر اسے پاتال کی اتھاہ گہرائیوں میں گرنا پڑا، اس وقت جب اس کے باپ نے انتہائی تنفر سے انگلی اٹھا کر اسے وارن کیا۔

”اپنی اوقات میں رہو اشعر! میں تمہیں اپنے ذاتی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دوں گا۔“ ان کے الفاظ جتنے بُرے تھے اس سے بھی زیادہ بُرا ان کا لہجہ تھا۔ وہ ساکت کھڑا رہ گیا۔

اگلے چند روز میں وہ چپ چاپ ایبرو ڈچلا گیا۔ زاہد صاحب (اشعر کے والد) کے دوسری بیوی سے دو بچے تھے ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ اشعر کے ایبرو ڈ آنے کے بعد ان کا تمام کاروبار ان کے دوسرے سگے بیٹے نے سنبھال لیا۔ اشعر دریاغیر میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی محنت کے بل بوتے پر روزگار حاصل کر کے دولت کماتا رہا۔

صدف سے اس کی شادی زاہد صاحب کی پسند سے ہی ہوئی تھی۔

وہ اپنی اوقات سے اچھی طرح واقف تھا، تبھی اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا تاہم اس نے صدف کی بھی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا ایک روز جیسے ہی صدف کو اس کی سچائی کا پتا چلے گا، وہ اس کے منہ پر تھوک کر چلی جائے گی اور یہی وہ نہیں چاہتا تھا۔

شب و روز کے ساتھ میں جائز حقوق کے ساتھ کسی کے حسین سراپا سے نظریں چرانا اتنا آسان بھی نہیں تھا مگر اسے خود پر ضبط تھا اور کوئی بھی انسان جب ضبط کے کڑے مراحل

سے گزرتا ہے تو اس کے اندر کی دنیا میں توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی ہے کچھ ایسی ہی توڑ پھوڑ آج کل اس کے اندر بھی ہو رہی تھی۔

...☆☆☆...

ماہِ رمضان کی آمد آمد تھی۔

وہ کافی دیر سے ٹیرس پر کھڑی بارش کی ہلکی ہلکی بوندوں کو انجوائے کرتی اشعر علی کے بارے میں سوچ رہی تھی، جب اس کی چھوٹی بہن آرزو دو کپ چائے اور کبابوں کے ساتھ وہیں چلی آئی۔

”السلام علیکم جناب! اتنے اچھے موسم میں یوں چپکے چپکے تنہا کسے سوچا جا رہا ہے؟“

”کسے سوچ سکتی ہوں؟“ وہ مسکراتے ہوئے پلٹی تھی، آرزو بھی مسکرا دی۔

”بہت گریٹ ہو آپی قسم سے، ورنہ میرا ایسا سٹریل بندہ ہو تو میں کبھی اس سے پیار نہ کر سکوں۔“

”قبل از وقت کی باتیں ہیں یہ محترمہ! جب شادی ہوگی تب پوچھوں گی۔“

”ٹھیک ہے پوچھ لیجیے گا۔ ابھی تو یہ بتائیں رمضان شروع ہو رہا ہے شاپنگ کا کیا کرنا ہے؟“

”وہی جو ہر سال کرتے ہیں، مطلب کل چلیں گے مارکیٹ، پرسوں مجھے گھر واپس جانا ہے۔“

”جی نہیں، اس بار جب تک اشعر بھائی آپ کو خود نہیں لے جاتے آپ نہیں جائیں گی۔“

”پاگل ہوئی ہو، وہ بہت مصروف ہوتے ہیں پھر تم نہیں جانتیں، اس گھر میں خضوع و خشوع سے رمضان کے اہتمام کا رواج نہیں ہے۔ صرف اشعر اور بریرہ (نند) روزہ رکھتے ہیں، وہ بھی جب میں سحری بنا کر ان کو زبردستی اٹھاتی ہوں تب، اشعر کو تو منہ بھی بیڈ پر ہی دھلواتی ہوں اور ساری چیزیں بھی وہیں بیڈ پر پہنچاتی ہوں، تب وہ سحری کرتے ہیں اور پھر نماز پڑھتے ہی سو جاتے ہیں۔“

”واہ جی واہ! بالکل صحیح جگہ قسمت پھوڑی ہے ممانے آپ کی۔“

”چپ! ممانے کے لیے ایک بھی لفظ کہا تو بہت ماروں گی۔“

”اچھا جی، ایک تو آپ ہر وقت ہٹلر بنی رہتی ہیں۔ ویسے اشعر بھائی میرے جیجو ہیں، میرا دل چاہتا ہے آپ کہ وہ یہاں آئیں، ہنسی مذاق کریں، ہم مل کر گھومنے جائیں، شاپنگ کریں وغیرہ وغیرہ۔“

”وغیرہ وغیرہ کی بچی! ان کا ایسا مزاج نہیں ہے۔“

”بس رہنے دیں۔“ صدف چائے ختم کر چکی تھی تبھی موڈ بنا کر برتن اٹھا کر لے گئی تو وہ پھر سے سوچوں میں ڈوب گئی۔ اس شخص کا رویہ اب اسے بھی شدت سے محسوس ہونے لگا تھا۔ آخر وہ ایسا کیوں تھا؟ اسے کیوں اپنی زندگی میں کسی کے ہونے نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا تھا؟ اس ڈائری میں ایسا کیا تھا جس نے اسے اتنا مشتعل کر دیا تھا؟

وہ اس کی فرماں برداری، محبت اور توجہ کو خاطر میں کیوں نہیں لاتا تھا؟ آخر وہ شخص اتنا الجھا ہوا کیوں تھا؟

سوچوں کا ایک لامتناہی سمندر تھا، جس میں وہ ہمہ وقت غوطہ زن رہتی تھی۔

اگلے روز آرزو کی فرمائش پر وہ مارکیٹ چلی آئی تھی۔ صبح ناشتہ نہ کرنے کی بدولت چند چکروں کے بعد ہی اسے صحیح معنوں میں چکر آنے لگے تھے مگر آرزو آرام سے گھوم پھر کر

ایک ایک چیز خوب چھان پھٹک کر قیمت کم کروا کر خرید رہی تھی، وہ لوگ شاپنگ سے فارغ ہوئیں تو اچانک صدف کی نظر دیدہ زیب چوڑیوں کے ایک سیٹ پر جا پڑی، چوڑیاں بہت خوب صورت تھیں مگر اس کے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے، پرس میں اب صرف اتنے پیسے تھے کہ وہ ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے واپس پہنچ سکتیں۔ تبھی اس نے نظر چرائی تھی مگر آرزو ان چوڑیوں کے لیے اس کی پسندیدگی بھانپ چکی تھی تبھی اس کی بے تاب نظر پھر نیچے روڈ پر پھسلی اور اس بار اسے مایوس نہیں ہونا پڑا تھا، وہ آگیا تھا۔

شاپنگ پلازہ کے سامنے گاڑی کھڑی کیے وہ اب اسے لاک کر رہا تھا، آرزو اطمینان سے مسکرا دی۔

”السلام علیکم!“

صدف کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ وہاں آجائے گا۔ تبھی وہ حیران ہوئی تھی مگر آرزو کے مسکراتے لبوں نے اسے کچھ گڑبڑ کا احساس ضرور دلایا تھا۔

”وعلیکم السلام اشعر بھائی! کتنی دیر لگا دی آپ نے ہم لوگ بس اب گھر واپس لوٹنے ہی والے تھے۔“

”سوری! میں نے آپ کا میسج لیٹ پڑھا تھا، میٹنگ میں مصروف تھا۔“ اچھٹی سی نظر صدف پر ڈالتے ہوئے وہ آرزو کے شکوے کا جواب دے رہا تھا، وہ رخ پھیر گئی۔

”چلیں شکر ہے آپ آتو گئے، مجھے لگا آپ آئیں گے ہی نہیں۔“ آرزو خوش لگ رہی تھی، اشعر مسکرا دیا۔

”نہیں، اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“

وہ شخص مسکراتا بھی تھا؟ صدف نے خاصی حیرانی سے اس کے مسکراتے لب دیکھے تھے۔

”کھانا کھانا ہے؟“ صدف کو نظر انداز کیے وہ آرزو سے ہی پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“

”اور آئس کریم؟“

”وہ تو ضرور کھا ہی لگے۔“

”تو چلیں پھر...“

”ہوں... مگر ایک بات ہے اشعر بھائی جو میں نے بس آپ کے کان میں ہی کہنی ہے۔“

صدف کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے کیا بات کہنا چاہتی ہے تبھی وہ چپ رہی تھی تاہم آرزو اب اشعر کو سائیڈ پر لے جا کر اس کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی اور وہ ذرا سا جھک کر اس کی بات سن رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد آرزو کے ساتھ جا کر اس نے صدف کی پسند کی چوڑیاں خرید لیں۔ صدف کے گھر واپس آنے تک اس کا رروائی کا پتا نہیں چلا تھا۔ تاہم اسے ایک بات ضرور اچھی لگی تھی اور وہ یہ کہ جس وقت اس نے آئس کریم کا آدھا کپ بچا کر رکھ دیا تھا تب اشعر نے اپنا کپ چھوڑ کر اس کی بچائی ہوئی آئس کریم کھائی تھی۔

...☆☆☆...

کوئی بھول نہ ہو جائے

تیری ڈاچی کے مڑنے تک

ہم دھول نہ ہو جائیں

وہ اپنے سسرال خود ہی واپس آچکی تھی۔

اس روز آفس سے واپسی پر اشعر کو وہ کچن میں نظر آئی تو بے ساختہ ایک پُر سکون سا احساس اس کے اندر تک سرایت کر گیا۔ اگلے روز پہلی سحری تھی۔ صدف نے رات میں سونے سے قبل ہی ٹائم سیٹ کر کے الارم لگا دیا تھا۔

الارم بجا تو اس کے ساتھ اشعر کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اس کی خریدی ہوئی چوڑیاں اس وقت صدف کی کلائی میں تھیں۔ وہ اس کے پہلو سے اٹھنے لگی تو اشعر نے بے ساختہ اس کی کلائی پکڑ لی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”کچن میں۔“

”کیوں؟“ وہ جانتا تھا پھر بھی پوچھ رہا تھا۔ صدف نے کلائی چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

”آج پہلا روزہ ہے، مجھے سحری بنانی ہے، تہجد کے نفل پڑھنے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، مگر کل سے الارم مت لگانا پلیز۔“

”کیوں! کیا آپ روزہ نہیں رکھیں گے؟“

”نہیں!“ اس کی کلائی چھوڑتے ہوئے اس نے تکیہ اٹھالیا تھا۔

”کیوں... کیوں نہیں رکھیں گے؟“ وہ از حد حیران ہوئی تھی۔ اشعر نے پلکیں موند لیں۔

”میرے جیسے شخص کی عبادات سے کائنات کے مالک کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”استغفار! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ عبادت تو ہم اپنے نفع نقصان کے لیے کرتے ہیں اللہ رب العزت کی ذات پاک کو کیا فرق پڑنا، وہ تو بے نیاز ہے۔“

”اوکے، ابھی جانو پلیز۔“ پل میں وہ پھر تلخ ہو گیا تھا۔ صدف دل گرفتہ سی بیڈ سے اتر آئی۔ اس نے اکثر دیکھا تھا۔ اشعر سردیوں میں بھی گھنٹوں شاور کے نیچے کھڑا خود پر پانی بہاتا رہتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اپنی چیزوں کو اتنا صاف رکھتا تھا کہ معمولی سی گرد بھی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی ایک عجیب سی بے چینی ہمہ وقت اسے گھیرے رہتی تھی۔

اس کے حلقہ احباب میں کوئی بھی قریبی دوست نہیں تھا۔ ایک ماہ پہلے اسے لڑکیوں سے بھی دلچسپی نہیں تھی، وہ فلموں کا بھی شوقین نہیں تھا اگر اتفاق سے کوئی مووی لگی ہوتی تب بھی بے زاری سے رخ پھیر لیتا۔ گھر میں بھی کسی کے ساتھ اس کی انڈر سٹینڈنگ نہیں تھی وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتا تھا جس سے گھر میں کسی کو اس کے ساتھ الجھنے کا موقع ملے۔ بے

حد محتاط رہتا تھا‘ زاہد صاحب اپنی پراپرٹی اور بزنس کا شیئر کرنا چاہ رہے تھے تب بھی اس نے بڑی سہولت سے ان کی جائیداد میں سے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا تھا‘ صدف اس پر بھی بے حد حیران تھی۔

اشعر نے پہلا روزہ نہیں رکھا تھا۔ صدف نے بہت کوشش کی اسے اٹھانے کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ مجبوراً اسے بُریرہ پر محنت کرنی پڑی کیونکہ زاہد صاحب دل کے مریض تھے اور ان کی دوسری بیوی کو اپنی چہیتی بہو کے ساتھ چھوڑ کر دن میں پیٹ پوجا کرنے کی بیماری تھی‘ ایسے میں صدف سحری سے فارغ ہو کر نماز پڑھتی پھر دیر تلک قرآن پاک کا ترجمہ کے ساتھ مطالعہ کرتی پھر تھوڑی دیر آرام کر کے گھر کے دوسرے کاموں میں لگ جاتی۔

اس روز پندرہواں روزہ تھا۔ جانے اس کے من میں کیا آئی کہ وہ معمول کا کام نہ پٹا کر بشیر احمد کے کمرے کی طرف چلی آئی‘ جسے چند سال قبل قدرے بہتر کوارٹر اور بہترین تنخواہ دی جا رہی تھی۔ وہ اشعر کی کہانی جانا چاہتی تھی اس کہانی کا الجھا ہوا سراڈھونڈنا چاہتی تھی کیونکہ جتنی ڈائری اس نے پڑھی تھی اس کے مطابق بشیر احمد کا اشعر کی زندگی میں بڑا اہم کردار تھا۔

جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوئی‘ بشیر احمد چارپائی پر نیم دراز تھا۔ اسے دیکھتے ہی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”سلام بی بی جی!“ وہ اب کافی بوڑھا اور ضعیف ہو گیا تھا۔ صدف سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتی‘ دوسری چارپائی کے کونے پر ٹک گئی۔

”بشیر صاحب! میں آپ سے کچھ جاننے کے لیے آئی تھی وہ بات جو میں اس گھر کے کسی اور فرد سے نہیں پوچھ سکتی۔“ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بات کا آغاز کیا تھا اور پھر اشعر کی ڈائری کی ساری کہانی ان کے گوش گزار کر دی۔ بشیر احمد اسے کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا مگر اس کی ضد پر مجبور ہو کر اس نے اشعر کی زندگی سے متعلق سارا سچ اسے سنا دیا‘ جسے سن کر وہ شاکڈ رہ گئی تھی۔

بشیر احمد کے کوارٹر سے اپنے کمرے میں آنے تک اسے لگا جیسے اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ ہی نہیں دے رہی ہوں۔ اشعر کے آفس سے آنے میں ابھی کافی ٹائم تھا‘ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر‘ دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے دیر تک روتی رہی۔

وہ آفس سے آیا تو صدف افطاری میں مصروف تھی مگر پھر بھی اس کے چہرے سے اس کے رونے کا پتا چل رہا تھا۔ اس پر تھکن غالب تھی تاہم صدف کا چہرہ دیکھ کر وہ مزید الجھ گیا۔ کیا اس کی گھر میں کسی سے لڑائی ہو گئی تھی؟ مختلف سوچیں ذہن میں آرہی تھیں، وہ سر جھٹکتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ آیا۔

عشاء کی نماز کے بعد جب وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا صدف اس کے پاس آئی تھی۔

”وہ... مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔“

”ہوں کہو۔“ فوراً سے بیش تر وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”مجھے آپ سے طلاق چاہیے۔“ رخ پھیر کر جانے کیسے اس نے کہہ دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ

ساکت رہ گیا۔

”کیا...؟“

”جی ہاں، مجھے لگتا ہے شاید میں آپ کی زندگی میں فٹ نہیں ہوں، سو پلیز مجھے خلع کے

لیے عدالتوں کا رخ کرنے پر مجبور مت کیجیے گا۔“

”کیا گھر میں کچھ ہوا ہے؟“

”جی نہیں، نہ ہی گھر والوں کے کسی عمل سے مجھے کوئی فرق پڑتا ہے، میری ذات آپ سے وابستہ ہے اور میں آپ کے ساتھ خوش نہیں ہوں، بس۔“

”ٹھیک ہے۔“ صدف کے مضبوط لہجے پر بہت شکستگی کے ساتھ اس نے کہا تھا مگر اس کے ہاتھوں کی انگلیاں واضح کپکپا رہی تھیں۔ جس نقصان سے اسے ڈر لگتا تھا بالآخر وہ نقصان بھی ہو گیا تھا۔

وہ رات اس پر قیامت کی رات تھی۔ ساری رات اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہا تھا۔ اگر وہ جائز اولاد نہیں تھا تو اس میں اس کا کیا قصور تھا؟ اس نے تو نہیں کہا تھا کسی سے کہ مجھے ناجائز پیدا کرو۔ وہ تو سارے وہی کام کر رہا تھا جو دوسرے جائز پیدا ہونے والے لوگ کرتے تھے پھر ہر قدم ہر گام پر تکلیف اسی کے حصے میں کیوں آرہی تھی؟

قدرت نے تو اس کے ناجائز وجود کو اپنی کسی رحمت اور نعمت سے محروم نہیں کیا تھا تو پھر اس کے بنائے ہوئے انسانوں نے اس کے لیے اپنے دل کیوں سکڑ لیے تھے۔ یہی سوچیں، یہی خیالات ہمہ وقت پاگل کیے رکھتے تھے۔

وہ ٹوٹنا نہیں چاہتا تھا

زندگی میں اس نے ہمیشہ ہر چھن جانے والی چیز کے لیے صبر کر لیا تھا مگر اس سے اس لڑکی کے لیے صبر نہیں ہو رہا تھا جو اس کی پسندیدہ ہمسفر تھی۔

شادی کے بعد کتنی بار اس نے اسے چھونا چاہا مگر صرف اس خوف کے پیش نظر قریب نہیں آیا کہ کہیں وہ اس کا عادی نہ ہو جائے۔ کہیں وہ کانچ سا وجود اور سونے جیسا دل رکھنے والی لڑکی اس کی اصلیت جان کر اسے دھتکار نہ دے۔ وہ اپنا نفس مار کر رہ جاتا تھا اور بالآخر اگلے روز شام میں اس پر یہ حقیقت بھی کھل گئی کہ صدف اس کی ذات کے بارے میں سب جان گئی ہے تبھی اس نے علیحدگی کا فیصلہ کیا تھا۔

پورے دن آفس میں اس کا دماغ پھٹتا رہا۔ شام میں افطاری کے بعد صدف کمرے میں آئی تو اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔

”میں جانتا ہوں تم میری ذات کی سچائی کے بارے میں جان گئی ہو، اسی لیے بھاگ رہا تھا تم سے مگر ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ تمہیں حق ہے کہ تم اپنی پسند کے شخص کے ساتھ

زندگی بسر کرو، میں تمہیں زبردستی اپنی زندگی میں نہیں روکوں گا مگر ایک ریکویسٹ ہے اگر مان لو تو...“

”جی کہیے۔“ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اس نے اس کی لہو رنگ آنکھوں میں دیکھا تھا۔ کتنی بے بسی، کتنا اضطراب تھا وہاں، وہ کٹ کر رہ گئی۔

”میرا ایک دوست وکیل ہے، وہ اس وقت ملک سے باہر ہے، اس کی واپسی تک انتظار کر لو، میں طلاق دے دوں گا۔“

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا مگر وہ ضرور ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ ایک سال ہو گیا تھا اسے اس شخص کی رفاقت میں رہتے ہوئے اس ایک سال میں بہت سے موسم ان دونوں نے اکٹھے دیکھے تھے، بہت کچھ ایک ساتھ سہا تھا، کیا اس کے لیے اب یہ ممکن تھا کہ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ دیتی (وہ تو صرف اس کا امتحان لینا چاہتی تھی، اسے آزما رہی تھی) اس شخص کا ہاتھ جسے زندگی نے سوائے ذلت اور اذیت کے اور کچھ نہیں دیا تھا۔ بھری دنیا میں کون تھا اس کا جو اس کے درد کو سمجھتا، جس سے وہ اپنے دل کی باتوں کو شیئر کر سکتا۔

بیڈ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے وہ سوچتی رہی تھی اور الجھتی رہی تھی جب کہ اس کے پہلو میں کروٹ بدل کر لیٹا اشعر علی ایک عجیب سی آگ میں جل رہا تھا وہ آگ جو اس نے کبھی دیکھی نہیں تھی مگر پل پل جسے اس نے شدت کے ساتھ محسوس ضرور کیا تھا۔

...☆☆☆...

رمضان کا آخری عشرہ تھا۔

بریرہ اس کی ساس اور یاسر کی بیوی کے روز بازار کے چکر لگ رہے تھے۔ ان لوگوں کے لیے روزے فرض نہیں تھے مگر عید پر پوری سجدہ حج اور شاپنگ ضرور فرض تھی، صدف نے محسوس کیا تھا اشعر بہت

چپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے ہمہ وقت سرخ رہنے لگے تھے۔ وہ اس کے لیے کھانا بناتی تو وہ کھانے سے انکار کر دیتا، چائے بناتی تو چائے پینے سے انکار کر دیتا، اس کا کوئی سوٹ پریس کرنے کے لیے نکالتی تو وہ چھین لیتا، وہ اس کے ہاتھوں مسلسل ہرٹ ہو رہی تھی مگر خاموش تھی۔

اس روز بھی ابھی وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر لیٹی تھی جب وہ کمرے میں چلا آیا۔ بکھرے بکھرے سے رف حلیے میں بھی اس کی وجاہت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ صدف اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھی تھی جب کہ وہ بیڈ کے کونے پر ٹک گیا تھا۔

”میں ایبرو ڈجار ہا ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ... طلاق کے کاغذات میں نے بنوا لیے ہیں، تم سائن کر کے رکھ دو، صبح میں بھی سائن کر دوں گا۔“

بناس کی طرف دیکھے وہ اسے بتا رہا تھا، وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

”کیا ایبرو ڈجار ہا ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے؟“

وہ چپ بیٹھا رہا تھا تبھی اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی کو چھوا تو وہ جل رہی تھا۔

”اتنا تیز بخار ہے آپ کو اور آپ نے بتایا بھی نہیں۔“

”میرا کیا واسطہ ہے تم سے جو میں تمہیں بتانا چاہوں۔“ درشتگی سے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ دھاڑا تھا۔

”مت لگایا کرو میرے وجود کو اپنا ہاتھ‘ اب تو پتا چل گیا ہے ناں تمہیں کہ میں کون ہوں؟

میری کیا حیثیت ہے؟ گند میں لتھڑا ہے میرا وجود‘ بے نام انسان ہوں میں‘ یہاں وہ لوگ جو روزِ زنا کرتے ہیں‘ شراب پیتے ہیں‘ لوگوں کا بیوپار کرتے ہیں‘ وہ معتبر ہیں کیونکہ ان کے پاس جھوٹ کا ہی سہی مگر کوئی نہ کوئی حوالہ ہوتا ہے‘ میرے پاس کسی کا کوئی حوالہ نہیں ہے‘ اس لیے جس کا دل چاہتا ہے مجھے ادھیڑتا ہے‘ میری زندگی میں آتا اور پھر چلا جاتا ہے۔“ اب اس کا لہجہ بھرا ہوا تھا۔ صدف بیڈ سے اتر کر اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”مگر میں اب آپ کی زندگی سے کہیں نہیں جا رہی‘ مجھے طلاق نہیں چاہیے۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے مجھ پر احسان کرنے کی‘ سنا تم نے۔“ ایک مرتبہ پھر وہ دھاڑا تھا۔ جواب میں صدف نے سائیڈ پر پڑے پیپر ز اٹھا کر بنا دیکھے پھاڑ دیئے۔

”مجھے احسان کرنے کی عادت نہیں ہے‘ ہاں محبت کر سکتی ہوں‘ اگر کوئی یقین کرے تو۔“

”جسٹ شٹ اپ!“ وہ از حد بدگمان تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

اسی رات جب وہ بے چین سا اس کے پہلو میں لیٹا تھا۔ اس نے کروٹ بدل کر اس کا بازو سہلایا تھا۔ مگر وہ لا تعلق سا لیٹا رہا‘ تبھی اس نے اٹھ کر جھجکتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔ کچھ دیر قبل اس نے اسے زبردستی دوا بھی کھلائی تھی‘ اسے معلوم تھا کہ وہ گلیشیر فوری پگھلنے والا ہے تبھی وہ دھیرے دھیرے اس کا اعتبار جیتنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اگلے روز اس نے اسے زبردستی اٹھا کر روزہ بھی رکھوا دیا تھا‘ وہ اب اس کا خیال یوں رکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی چھوٹا سا بچہ ہو۔ عید کے آنے میں ابھی چھ روز باقی تھے۔ صدف یا سر کی بیوی یمنی کے اصرار پر اس روز اس کے ساتھ مارکیٹ چلی آئی۔ یمنی نے اپنے لیے ایک سوٹ پسند کیا تھا جو تیس ہزار سے کم سیل نہیں کر رہا تھا دکان دار اس وقت اس نے چھوڑ دیا تھا مگر اب وہ ہی سوٹ لینے آئی تھی کیونکہ یا سر نے اسے پیسے دے دیئے تھے۔

صدف نے خود ابھی تک اپنے لیے کوئی شاپنگ نہیں کی تھی نا ہی اس کا دل چاہ رہا تھا۔ شاپنگ کے بعد یمنی اسے قریبی ریستوران میں لے آئی تھی اور وہیں اس نے اشعر کو ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا‘ وہ دونوں بھی شاید شاپنگ کر کے آئے تھے کیونکہ ان کے قریب بھی بڑے بڑے شاپنگ بیگز تھے‘ صدف کی آنکھیں جل اٹھیں۔

اشعر کی نظر بھی اس پر پڑ چکی تھی، مگر وہ شرمندہ ہونے کی بجائے بے نیاز دکھائی دے رہا تھا، تبھی وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے پاس گئی تھی۔ اشعر فوری کھڑا ہو گیا، اس کے ساتھ والی لڑکی بھی چونک گئی تھی تبھی اس نے بنا کچھ کہے بھرپور شدت کے ساتھ اسے زور کا تھپڑ رسید کیا اور واپس پلٹ آئی۔

اشعر رات میں دیر سے گھر واپس آیا تو وہ جاچکی تھی۔

روح کو چھیدتی تنہائی پورے کمرے میں بکھری اس کا منہ چڑاتی رہی، وہ بے زار ہو کر کمرے سے نکل آیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور صدف بارش کی دیوانی تھی تبھی وہ دیر تک باہر بارش میں کھڑا بھیگتا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب صدف کی طرف سے طلاق کا مطالبہ ضرور ہو گا مگر... ایسا نہیں ہوا تھا۔

...☆☆☆...

افطاری کے بعد کا وقت تھا۔

وہ ادا اس سی ٹیرس پر کھڑی، سڑک کے اس پار جگمگاتی روشنیوں کے نظاروں میں گم تھی، جہاں لوگ عید کا چاند نظر آنے کی خوشی میں خوب شور و غل کر رہے تھے۔ وہ چپ چاپ

کھڑی آنسو بہاتی رہی۔ اسے اشعر علی سے عشق نہیں تھا مگر وہ اس سے محبت ضرور کرنے لگی تھی۔ اس کی عزت کی خاطر اس نے تاحال گھر میں کسی کو بھی اس کی ذات کی سچائی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ نہ ہی بتانے کا ارادہ رکھتی تھی،

بالکل ویسے ہی جیسے اشعر نے اسے نہیں بتایا تھا کہ زاہد صاحب نے اپنی جائیداد کی تقسیم کر دی تھی اور اشعر کو انہوں نے یاسر کے برابر کا حصہ دیا تھا۔

اشعر کو قطعی ان کے اس فیصلے کا گمان نہیں تھا مگر جس وقت چاند رات کے شور و غل میں انہوں نے اسے گلے لگا کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور یہ کہا کہ ”تم میرے بیٹے ہو اشعر! میرا نام تمہارا حوالہ ہے میں نے اپنے رب کے مقدس گھر سے تمہیں پایا، تم نے ہم میاں بیوی کی زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھرے بہت احسان ہیں تمہارے اس بوڑھے باپ کی زندگی پر، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہارا باپ تمہیں تمہارا حق نہ دے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے تم صدف بیٹی کے ساتھ گائوں کی حویلی میں رہو گے اور ساری زمینوں کا انتظام سنبھالو گے۔

یہاں شہر کی فیکٹری میں بھی تمہارے ففٹی پرسنٹ شیئرز ہیں، جب دل چاہے یہاں رہنا اور جب دل چاہے وہاں، کوئی پریشانی نہیں ہے، ہاں ایک گزارش ضرور کروں گا، صدف

بہت اچھی لڑکی ہے اسے کبھی اپنی زندگی سے جانے مت دینا، بہت پیار کرتی ہے وہ تم سے،
میں جانتا ہوں جائو لے آؤ اسے۔“ اور تبھی اس کے دماغ میں صدف کی بات گونجی تھی۔

”مجھے احسان کرنے کی عادت نہیں، ہاں محبت ضرور کر سکتی ہوں اگر کوئی یقین کرے تو۔“

اور تبھی اس کے دل کی ایک بیٹ مس ہوئی تھی، اس وقت وہ زاہد صاحب کے گلے لگ کر
دیر تک بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا رہا تھا اور وہ اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اسے تسلی دیتے
رہے۔ آرزو چھت پر آئی تو وہ چپ چاپ کھڑی بے آواز رہی تھی۔

”چاند رات مبارک آپ! عید کا چاند نظر آگیا ہے، چلیں ناں مار کیٹ چلتے ہیں۔“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تم ماما کے ساتھ چلی جاؤ۔“

”کیوں، آپ کی طبیعت کو کیا ہوا؟“ اب وہ اس کے برابر میں کھڑی اس سے پوچھ رہی
تھی۔

”پتا نہیں۔“ اس کا لہجہ بھرا رہا تھا، آرزو مسکرا دی۔

”ٹھیک ہے، اگر میں آپ کے ڈاکٹر کو لے آؤں تو؟“

اس بار وہ چونکی تھی اور تبھی اس کی نظر پیچھے ہی کچھ فاصلے پر کھڑے اشعر علی پر پڑی تھی،
جس کی آنکھیں اس لمحے چاند کی مانند ہی جگمگا رہی تھیں، وہ دیکھتی رہ گئی۔

”السلام علیکم، عید مبارک!“ ستاروں سی روشن نگاہوں کے ساتھ وہ مسکرا رہا تھا۔ آرزو
موقع دیکھ کر چپکے سے کھسک گئی۔

”وعلیکم السلام!“ بمشکل وہ لبوں کو جنبش دے پائی تھی۔ اشعر آگے بڑھ آیا۔

صدف کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ رہے تھے، اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ آنسو سمیٹ لیے۔

”ایم سوری صدف! ان تمام دنوں کے لیے جو تم نے میری رفاقت میں افیت اٹھاتے ہوئے

بسر کیے۔ میں وہ سب کرنا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے لگا شاید میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم

میرے ساتھ بھی رہو۔ میں خود کو تمہارا عادی ہی نہیں بنانا چاہتا تھا مگر... مجھے کب تمہاری

عادت ہو گئی پتا ہی نہیں چلا۔“ سر جھکائے اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

”کل تک مجھے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ زندگی بسر کرو گی، مگر آج جب

پاپا نے کہا کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو تو... مجھے لگا جیسے زندگی کو مجھ پر ترس آگیا ہو، میرا یقین

کرو صدف! میں نے سوائے تمہارے کسی لڑکی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا، اس روز

تم نے ریسٹوران میں جس لڑکی کو میرے ساتھ دیکھ کر مجھے تھپڑ مارا، وہ میرے دوست کی بیوی تھی، میرا دوست اس وقت کھانا آرڈر کر کے واش روم میں گیا تھا، خیر مجھے برا نہیں لگا۔“ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں، صدف شرمندگی سے سر جھکا گئی۔

”ایم سوری...!“

”نہیں کوئی سوری نہیں، یہ بتاؤ عید کی شاپنگ کرنی ہے کہ نہیں؟“

”نہیں!“ وہ اب ہلکی پھلکی ہو کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اشعر مسکرا دیا۔

”کنفرم ہے ناں... نہیں؟“

”جی نہیں!“ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ بھی مسکرائی تھی۔ اشعر نے گہری سانس بھرتے

ہوئے سراٹھا کر ایک نظر اوپر روشن آسمان کی طرف دیکھا پھر دھیرے سے صدف کا گال

چھوتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ آیا۔

بے شک کائنات کے خالق نے اس عید پر بھی اسے ہمیشہ کی طرح اپنی بے شمار نعمتوں سے

نوازا دیا تھا۔

